© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

غیر اسلامی ریاست میں مسلمان کا کردار

سیّد جلال الدین عمری

کسی نظریہ پر سنجیدہ بحث اور گفتگو غلط نہیں ہے، بلکہ یہ مختلف پہلوؤں سے مفید ثابت ہوتی ہے۔ لیکن بے جا جرح و تنقید اور جارحانہ حملوں کو صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ ایک ناجائز اور نامعقول رویّہ ہے۔ اس سے مسئلہ کو سمجھنے میں مدد نہیں ملتی بلکہ الجھنیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ موافق اور مخالف افراد کے درمیان ذہنی دوری پیدا ہوتی اور اس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس کا اثر پوری زندگی پر پڑتا ہے۔ افسوس کہ اسلام کے بارے میں اس کے مخالفین نے بالعموم بحث و مباحثہ کا یہی غلط طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس کی تعلیمات کی من مانی تشریح کی جاتی ہے، اس پر وہ اعتراضات کیے جاتے ہیں جو اس پر وارد نہیں ہوتے، اس کے بارے میں دیدہ و دانستہ غلط فہمیاں پیدا کی اور پھیلائی جاتی ہیں۔ اسے صحیح شکل میں دیکھنے کی کوشش نہیں ہوتی۔ یہ کوئی نئی اور انوکھی صورت حال نہیں ہے، اس کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ آج یہ تاریخ مختلف اسباب کے تحت زیادہ زور اور قوت کے ساتھ دہرائی جارہی ہے۔ اسلام کا اس طرح ذکر ہوتا ہے جیسے وہ وحشت و بربریت کا دین ہے۔ اس کے افکار و تصورات غیر عقلی، غیر فطری، ناقابل عمل اور موجودہ دور کے لیے ناقابل قبول ہیں۔ اس کی اخلاقیات اور اس کے قوانین، عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتے، وہ انسانوں کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں تقسیم کرتا اور دونوں کے الگ الگ حقوق متعین کرتا ہے۔ اس کے نظام میں مساوات اور برابری نہیں ہے۔ دورِ حاضر کی اس بھیانک فضا اور برگشتہ ماحول میں ان افراد اور جماعتوں کو جو اسلام پر اپنے ایمان و یقین کا اظہار کرتی اور اسلام کو دنیا کے لیے باعثِ رحمت اور بہترین نظامِ حیات سمجھتی ہیں، فکری بے راہ روی کا شکار قرار دیتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعجب خیز نہیں ہے۔ وہ اپنے ایمان اور عقیدہ کے تحت اسلام کی سربلندی کی خواہاں ہیں اور اس کے لیے آئین وقانون کی حدود میں جدّوجہد کر رہی ہیں تو بھی انھیں وحشت وبربریت کا علم بردار تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کسی واقعہ یا حادثہ کے نتیجہ میں رونما ہونے والا ہنگامی ردّعمل نہیں ہے، بلکہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ اس وقت مسئلہ کسی خاص گروہ کا نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر پوری امت مسلمہ کا ہے۔ اس کے چاروں طرف بدگمانیوں اور غلط فہمیوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ اس کی تصویر اس طرح پیش کی جارہی ہے جیسے اس سے کسی خیر اور بھلائی یا اعلیٰ اخلاقیات کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس کا پورا کردار ہی مشکوک ہے اور سماج کے لیے اس کی افادیت کسی دور میں تھی بھی تو اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔

اسلام ان خیالات کی از اول تا آخر تردید کرتا ہے۔ اس کا ان سے دُور و نزدیک کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام نام ہے اللہ واحد کی عبادت واطاعت کا، تقویٰ اور انابت کا، امن وامان کا، خیر وبھلائی کی راہ میں پیش قدمی کا، اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار اپنے اور دوسروں کے اندر پیدا کرنے کا، انسان کو انسان سمجھنے، اس کے ساتھ خیرخواہی کا تعلق رکھنے، ظلم کو ختم کرنے اور عدل وانصاف کو قائم کرنے، انسانوں کے درمیان سے جھوٹے امتیازات کو مٹانے، ان کے ساتھ مساوات برتنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کا۔ اس کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کر کے ہر شخص اسلام کی اس تصویر کو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ ہزار کوششوں اور تدبیروں کے باوجود اس پر پردہ ڈالنا آسان نہیں ہے۔

غیر اسلامی ملک اور مسلمان

اسلام کا مطالعہ مختلف زاویوں سے ہو سکتا ہے۔

یہاں ایک خاص رخ سے اس کا مطالعہ پیش نظر ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے متعلق یہ تصوّر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ غیر اسلامی ریاست اور غیر اسلامی معاشرہ کے خلاف نفرت اور عداوت کے شدید جذبات ابھارتا ہے، اسے کسی قیمت پر تسلیم نہیں کرتا اور اپنے ماننے والوں کو اس سے محاذ آرائی اور بغاوت کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ اس لیے اسلام کے ماننے والے غیر اسلامی ملک کے وفادار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہری نہیں ہوسکتے۔ ان پر اعتماد کرنا اس کے لیے مشکل ہوگا، وہ دشمن سے ساز باز کرسکتے ہیں، ملک سے ان کی خیرخواہی مشتبہ رہے گی، غیرمسلم آبادی سے ان کے تعلقات صحیح نہیں ہوسکتے، ان سے بہتر سلوک کی توقع نہیں کی جاسکتی اور غیرمسلموں کی جان، مال اور عزت و آبرو کو ان سے خطرہ رہے گا۔ ان الزامات کا پوری دنیا میں مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک کہیں سے کوئی ثبوت تو نہیں ملا ہے، اس کے باوجود یہ ایک خاص ذہن ہے جو کبھی دبے لفظوں میں اور کبھی کھلے بندوں سامنے آتا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کو اس کے اظہار میں تامل ہوتا ہے لیکن بہرحال وہ بھی مسلمانوں کو خطرناک ضرور محسوس کرتے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ جو مسلمان کسی غیر اسلامی ملک یا غیرمسلم معاشرہ میں رہتے بستے ہیں، انھیں اسلام نے کیا ہدایات دی ہیں، ان کے لیے اس کے کیا احکام ہیں اور انھیں کن باتوں کی تعلیم و تربیت دی گئی ہے؟ اسی سے یہ فیصلہ کیا جاسکے گا کہ جو فرد یا گروہ اسلامی تعلیمات کا پابند ہے، اس کا کسی غیرمسلم ملک میں کیا کردار ہوگا، وہ ملک کا بہی خواہ ہوگا یا بدخواہ، ملکی فضا کو مکدّر اور ماحول کو خراب کرے گا یا اسے بہتر بنانے کی کوشش کرے گا، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں تعمیر میں لگیں گی یا تخریب کا ذریعہ ثابت ہوں گی، دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے اس کے تعلقات کا کیا حال ہوگا اور اس سے کس اخلاق و کردار کی توقع کی جائے گی؟

اسلامی ہدایات

غیر اسلامی ریاست یا غیرمسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے اسلام نے خاص ہدایت یہ دی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے عقیدہ اور فکر پر مضبوطی سے قائم رہیں، اس کے مطابق ممکنہ حد تک زندگی گزاریں۔ عقیدہ کو کسی بھی وقت اور کسی بھی حال میں چھوڑا جاسکتا ہے اور نہ اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ کی جاسکتی ہے۔ اسلام کی یہ ہدایت موجودہ دور کے تسلیم شدہ اس اصول کے عین مطابق ہے کہ ہر شخص کو اپنے عقیدہ پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ اسلام اس حق کو استعمال کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی کی عداوت اور دشمنی پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مبنی نہیں ہے، اس لیے اس سے ہراساں ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات سے یہ بھی واضح ہے کہ غیر اسلامی ریاست کا مسلمان شہری، ریاست کا اور اپنے وطن کا بہی خواہ اور مخلص ہوتا ہے۔ غداری اور بے وفائی اس کے عقیدے اور دین کے خلاف ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ جس ملک میں بھی اسلامی فکر کے تحت اس کی تعمیر و ترقی کی کوشش کرے، اسے صحیح فکر، اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیاست سے روشناس کرائے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ نظامِ حیات کو دلائل کے ساتھ پیش کرے اور اس پر غور و فکر کی دعوت دے اور خدا ترسی اور نیکی کا ماحول پیدا کرے۔ اس کے ساتھ وہ اعلیٰ کردار کا حامل ہو۔ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھے، اس کے حقوق پہچانے، مخالف فکر و عقیدہ کے حاملین سے بھی بہتر تعلقات رکھے اور ان کے ساتھ تہذیب، شرافت اور اخلاق کا رویّہ اختیار کرے۔

ایک مسلمان ان تعلیمات کا پابند ہے۔ اس کے اندازِ فکر سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن قانونی اور اخلاقی لحاظ سے معاشرہ میں اسے اپنا کردار ادا کرنے سے باز رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جو ہدایات دی ہیں وہ بالکل عام ہیں۔ ان کا تعلق مکّی دور سے بھی ہے جس میں مسلمان ایک غیر اسلامی معاشرہ میں زندگی گزار رہے تھے اور مدنی دور سے بھی ہے جہاں خالص اسلامی معاشرہ قائم تھا، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان ہدایات کا پابند صرف اسلامی معاشرہ ہے یا غیر اسلامی معاشرہ ہی سے ان کا تعلق ہے۔ ان کی اہمیت دونوں طرح کے معاشروں کے لیے ہے۔

جو مسلمان، غیر اسلامی ریاست کے شہری ہیں، انھیں اپنے دین و ایمان کے سلسلہ میں اسلام نے جو ہدایات دی ہیں، پہلے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دین پر استقامت

کسی بھی غیر اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کے لیے دینی لحاظ سے کم یا زیادہ، چھوٹے یا بڑے مختلف نوعیت کے مسائل ہو سکتے ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ حالات نسبتاً موافق ہوں اور حالات کے ناساز گار ہونے کا بھی امکان ہے۔ اس کا تعلق غیر اسلامی ریاست کے قانون، حکم رانوں کے رویّہ اور عوام کے مزاج سے ہے۔ اس میں اس بات کا بھی دخل ہے کہ خود اسلام کے ماننے والے اپنا دینی، اخلاقی اور سیاسی وزن کتنا رکھتے ہیں اور ان میں اپنے مسائل حل کرنے کی کتنی طاقت ہے؟

قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو ہر طرح کے حالات میں عزم وہمت اور حوصلے کے ساتھ دین پر قائم رہنے اور اس کے مطابق عمل درآمد کی تعلیم دی ہے۔ اس کی ہدایت ہے کہ حالات کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں اور ماحول کتنا ہی ناخوش گوار کیوں نہ ہو، مردِ مومن کو دین پر استقامت اور پامردی کا ثبوت دینا چاہیے۔ حالات کی شدّت اور نزاکت سے گھبرا کر دین وایمان سے دست کش ہوجانا یا اس میں کسی قسم کی مداہنت اختیار کرنا کسی صاحبِ ایمان کے لیے روا نہیں ہے۔ اس کے لیے حسبِ استطاعت بڑی سے بڑی قربانی سے بھی اسے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ مکہ کے نازک ترین حالات اور سخت آزمائش کے دور میں بار بار دین پر استقامت کی ہدایت کی گئی اور اس پر آخرت کی کامیابی اور جنت کی بشارت سنائی گئی۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا	بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا
اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ	رب اللہ ہے اور پھر استقامت دکھائی ان
عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا	پر (موت کے وقت) فرشتے نازل ہوتے
وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا	ہیں کہ تم نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو۔ تمہارے
بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝	لیے اس جنت کی بشارت ہے جس کا تم
نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ	سے وعدہ کیا جارہا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی
الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ	میں بھی تمہارے دوست رہے ہیں اور
وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ	آخرت میں بھی رہیں گے۔ تمہارے لیے
اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا	وہاں وہ سب کچھ ہے جو تمہارا جی چاہے
مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ	گا اور تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جو
غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝	تم طلب کروگے۔ یہ غفور ورحیم خدا کی
(فصلت: ۳۰-۳۲)	طرف سے میزبانی ہوگی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخالف ماحول میں استقامت پر جنت کی یہی خوشخبری ایک اور جگہ ان الفاظ میں دی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا ج جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (الاحقاف: ۱۳-۱۴)

بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر استقامت دکھائی ان کے لیے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ان کے ان اعمال کی جزا ہوگی جو وہ انجام دے رہے تھے۔

اللہ کے دین پر استقامت کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی مخالف ماحول میں اس کے دین کی طرف مسلسل دعوت دیتا رہے، اس کا حق ہونا ثابت کرے۔ اس کے بارے میں جو شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں پائی جائیں انھیں دور کرے اور اس بات پر مطمئن کرنے کی سعی کرے کہ وہی فلاحِ دارین کا واحد ذریعہ ہے۔ ارشاد ہے:

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ج وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ج وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ج وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ ج وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ج اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ط لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ج لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ج اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ج وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝ (الشوریٰ: ۱۵)

پس تم (سابقہ پیغمبروں کے) اسی دین کی طرف دعوت دو اور اسی طرح ثابت قدم رہو جس طرح حکم دیا گیا ہے۔ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور کہو کہ میں ایمان لاتا ہوں ہر اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے۔ مجھے تمہارے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ ہمارا رب اور تمہارا رب ہے۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت نہیں ہے۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

اس آیت سے ایک بات یہ نکلتی ہے کہ غیر اسلامی ریاست میں دعوت و تبلیغ کو اسلام اپنا ایک بنیادی حق قرار دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے یہ حق حاصل رہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاکہ جو شخص اسلام کو اللہ کے دین کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ آج کے دور میں اس حقیقت کو تسلیم کرلیا گیا ہے کہ کسی بھی عقیدہ کو قبول کرنا، اس کے مطابق عمل کرنا اور اس کی تبلیغ کرنا ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔

اس آیت سے دعوت کے بعض بنیادی اصول بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کی رعایت ضروری ہے۔

دین میں تبدیلی نہ ہوگی

غیر اسلامی ریاست میں دین کو بدلنے اور اسے مسخ کرنے کی کوشش بھی ہوسکتی ہے تاکہ اس کی انفرادیت اور امتیاز باقی نہ رہے اور وہ غیر اسلامی فکر اور تہذیب سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس کے لیے با اقتدار طبقہ اپنی خواہش کے مطابق دین کی توجیہ و تفسیر کرکے اسے قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہے، اس کا موقع نہ ہو اور حکمت و مصلحت اس کی اجازت نہ دے تو خود دین کے ماننے والوں کے سامنے اس میں ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ رکھا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ اس کے لیے معاشی اور سیاسی دباؤ، ترغیب اور لالچ، قانون سازی غرض مختلف تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ یہ مذہبی جبر و اکراہ کی ایک بدترین شکل ہے۔ اسے اسلام کبھی قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ مشرکین کے اس مطالبہ کو کہ قرآن میں تبدیلی کرکے اُن کے باطل عقائد کو بھی اس میں جگہ دی جائے تاکہ وہ ان کے لیے قابلِ قبول ہوسکے، قرآن نے یکسر رد کردیا اور کہا کہ اللہ کی کتاب میں ایک لفظ کی ترمیم و تنسیخ یا حذف و اضافہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ماننے والے اس کی اتباع کے پابند ہیں۔ اسے بدلنے کا اللہ نے انھیں کوئی حق نہیں دیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ	اور جب ہماری واضح آیات اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن پیش کرو یا کم از کم اس میں تبدیلی کردو۔ ان سے کہو کہ میں اس میں اپنی طرف سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (یونس: ۱۵)

کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ میں تو اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

اس معاملہ میں مشرکین کی طرف سے جو دباؤ تھا اس کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۳-۷۵)

کچھ بعید نہ تھا کہ یہ تمہیں فتنہ میں ڈال کر اس وحی سے ہٹا دیتے جو ہم نے تم پر کی ہے تاکہ تم اس کے سوا کوئی دوسری چیز گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دو۔ اس صورت میں وہ تمہیں ضرور اپنا دوست بنا لیتے۔ اگر ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم کچھ نہ کچھ ان کی طرف جھک جاتے اس وقت ہم تمہیں دنیا میں بھی دوگنا عذاب اور موت کے بعد بھی دوگنا عذاب دیتے۔ پھر تم ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے۔

اللہ کے دین میں ردّ و بدل اور ترمیم کی اس نے اپنے ماننے والوں کو اجازت دی ہے اور نہ کسی دوسرے کو۔ اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے کہ اس قسم کے ہر مطالبہ کو رد کر دیں اور ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیں۔

اقامتِ صلوٰۃ

نماز دین کا ستون ہے۔ اس کی ہر حال میں اور ہر جگہ پابندی ہونی چاہیے۔ نازک حالات میں یہ مومن کی قوت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ مشکلات میں صبر اور نماز سے مدد حاصل کی جائے۔ ارشاد ہے:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ — اور مدد طلب کرو صبر اور نماز سے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ۝ (البقرہ : ۴۵)
اور بے شک وہ بھاری ہے مگران لوگوں پر نہیں جن کے دلوں میں خشوع ہے۔

فرعون نے بنو اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے، ان کی نسل کشی جاری تھی، وہ غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، ان کی عورتوں کی بے حرمتی اور آبرو ریزی ہو رہی تھی، وہ ایک نہیں متعدد زیادتیوں کے شکار اور انسانی حقوق سے سراسر محروم تھے۔ ان سخت ترین حالات میں حضرت موسیٰؑ نے انہیں دین پر ثابت قدم رہنے اور نماز کے ذریعہ استعانت کا حکم دیا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ (البقرہ: ۱۵۳)
اور مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعہ۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک اور موقع پر ہدایت فرمائی۔

اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا (الاعراف : ۱۲۸)
مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر کرو۔

اوپر کی آیت سے واضح ہے کہ یہ نماز اور صبر کے ذریعہ استعانت کا حکم تھا مطلب یہ کہ ان حالات میں صبر سے کام لو۔ بے صبری کا مظاہرہ نہ کرو۔ ہراساں اور خوف زدہ ہو نہ مایوس اور دل شکستہ۔ دین پر پوری قوت سے جمے رہو۔ اس میں نماز سے مدد مل سکتی ہے، اس سے مدد حاصل کرو۔

اقامتِ صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے ظاہری شرائط اور تقاضے بھی پورے کیے جائیں اور اس کی روح بھی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ نماز اس طرح ادا کی جائے جس طرح ادا کرنے کا حکم ہے۔ اوقات کی پابندی ہو، فرائض کے ساتھ سنن و نوافل کا بھی اہتمام ہو۔ نماز میں خشوع و خضوع ہو، اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا احساس اور انابت و اخلاص ہو، بلکہ احسان کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح نماز کے ظاہری شرائط اور باطنی کیفیات جب یکجا ہو جاتی ہیں تو اس کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

مسلمانوں کی ہر بستی میں باجماعت نماز کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مساجد تعمیر ہوں، انھیں پاک صاف رکھا جائے۔ ان کا بہتر نظم و انصرام ہو۔ یہ اور اس طرح کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروری اقدامات سے اقامتِ صلوٰۃ کا تصور مکمل ہوتا ہے۔

نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار ہوتا ہے اور باجماعت نماز سے ایک ایسی امّت کا تصور ابھرتا ہے جس کے درمیان مساوات اور برابری ہے، چھوٹے بڑے اور شریف اور رذیل کا فرق نہیں ہے، اس کی صفوں میں اتحاد و اتفاق ہے، وہ انتشار سے محفوظ ہے، اس کا ہر فرد دوسرے کا ہمدرد و غم گسار ہے، امت کے اندر یہ جذبہ صحیح معنی میں پیدا ہو جائے تو اس کا کوئی بھی فرد مشکلات و مصائب میں بے یار و مددگار نہیں محسوس کرے گا بلکہ خود کو ہمدردوں کے درمیان پائے گا، اس طرح امت بڑی سے بڑی مشکل پر قابو پا سکتی ہے۔

رجوع الی اللہ

اس دنیا میں اہلِ ایمان پر سخت سے سخت آزمائشیں آسکتی ہیں۔ انہیں مشکل اور دشوار گزار حالات سے گزرنا پڑ سکتا ہے۔ کبھی یہ آزمائشیں یہ دیکھنے کے لیے بھی ہوتی ہیں کہ اہلِ ایمان اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہیں یا نہیں؟ ان میں کون مخلص ہے اور کون غیر مخلص؟ کون مومنِ صادق ہے اور کون منافق اور ریاکار؟

اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں مکہ کے مسلمان انتہائی صبر آزما اور زہرہ گداز حالات سے گزر رہے تھے۔ آزمائشیں تھیں کہ بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ قرآن مجید نے ان حالات میں کہا:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا	کیا لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کہ وہ
اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ	یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیے
لَا يُفۡتَنُوۡنَ ٥ وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِيۡنَ	جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی،
مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ	جب کہ ہم نے (ایمان کے دعوے پر)
الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ	ان سے پہلے کے لوگوں کو آزمایا ہے۔
الۡكٰذِبِيۡنَ ٥	اللہ تو ضرور ان لوگوں کو دیکھے گا جو سچے
	ہیں اور ضرور ان لوگوں کو بھی دیکھے گا جو
(العنکبوت: ۲-۳)	جھوٹے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی سلسلۂ بیان میں آگے چل کر فرمایا :

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (العنکبوت : ۱۱)

اور اللہ ضرور معلوم کرکے رہے گا ان لوگوں کو جو (سچے دل سے) ایمان لائے اور ان لوگوں کو بھی اللہ ضرور معلوم کرکے رہے گا جو منافق ہیں۔

اہل ایمان کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ہر طرح کی آزمائشوں میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ه (البقرہ : ۱۵۵)

اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔ (اس پر) صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو۔

اس کے بعد کہا گیا کہ ناسازگار حالات اور مشکلات میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس وجہ سے دنیا اور آخرت میں وہ اس کی رحمت اور عنایت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ ان کی قلبی کیفیت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ه اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ه (البقرہ : ۱۵۶-۱۵۷)

(صبر کرنے والے وہ ہیں) کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کی طرف سے رحمتیں ہیں اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

مصیبت میں اللہ کی طرف رجوع کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مومن کو زندہ و توانا فطرت ملتی ہے۔ جب بھی اس پر کوئی نازک گھڑی آتی ہے اور وہ مشکلات سے دوچار ہوتا ہے فوراً اسے اللہ کی طرف رجوع نصیب ہوتا اور وہ اس سے مدد طلب کرتا ہے۔ مصیبت میں بھی کسی کو اللہ کی طرف رجوع نصیب نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فطرت بے حسی کا شکار رہے۔ وہ اپنی تدبیروں پر اعتماد کرے گا، اللہ کی طرف نہیں پلٹے گا۔ حالانکہ اللہ کی نصرت کے بغیر اس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالات کی سنگینی اور شدت اور ہماری کمزوری اور ناتوانی اس بات کا شدید تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے، اس کے ذکر سے دل کو آباد رکھا جائے، اس سے فریاد کی جائے، اس سے دعائیں کی جائیں اور اس سے مدد طلب کی جائے، یہی ایک مومن کا کردار ہے۔ اس سے امید ہے ہماری تدبیریں کارگر ہوں گی، اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت حاصل ہو گی اور مشکلات رفع ہوں گی

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا	اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی
غَالِبَ لَکُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ	تم پر غالب نہ آسکے گا اور اگر وہ تمہیں
فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ	چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو
مِّنْ بَعْدِہٖ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ	تمہاری مدد کرے؟ اور اللہ ہی پر ایمان
الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (آل عمران: ۱۶۰)	والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اس دنیا میں عام انسانوں کے درمیان ایک مسلمان کو جو کردار ادا کرنا ہے اسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ یہ بڑا وسیع اور ہمہ جہت کام ہے۔ معروف میں صحیح عقیدہ اور فکر، اعلیٰ اخلاقیات، انسانی حقوق، مساوات اور عدل و انصاف جیسی وہ تمام خوبیاں آتی ہیں جنہیں اللہ کے دین کی سند حاصل ہے اور جن کے معروف ہونے کی عقل اور فطرت شہادت دیتی ہے۔ 'منکر' اس کے برخلاف فکری و عملی رویے کو کہا جاتا ہے۔ اس میں باطل عقائد و افکار، غلط اخلاقیات، نوعِ انسانی یا اس کے کسی بھی طبقہ کی توہین، جبر و تشدّد اور ظلم و زیادتی جیسا کردار شامل ہے۔ یہ وہ کردار ہے جسے اللہ کے دین کی منظوری حاصل نہیں ہے اور جسے انسان کی فطرت اور عقلِ سلیم ناپسندیدہ اور غلط قرار دیتی ہے۔

'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا اولین تقاضا یہ ہے کہ دنیا کو شرک، کفر اور الحاد کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے اور اسلام کے توحیدِ خالص کے تصوّر کو دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس وقت پوری دنیا کو مادہ پرستی نے اپنے شکنجے میں بری طرح کس رکھا ہے۔ اس کی ذہنی اور فکری تربیت خالص مادّی نقطۂ نظر سے ہو رہی ہے۔ اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاقیات، معاشرت، معیشت اور سیاست اسی کے تابع ہے۔ ذاتی اور گروہی مفادات کے ٹکراؤ کی وجہ سے دنیا جہنم کدہ بنی ہوئی ہے۔ روحانی اور اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہو رہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر فرد اور ہر گروہ نے ظلم و تشدّد، ناانصافی اور مکر و فریب کو بغیر کسی جھجک کے راہِ عمل قرار دے لیا ہے اور قدم قدم پر انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔

اس کے بالکل برعکس اسلام انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں کی بہتر تکمیل کرتا ہے، اس کا بنیادی تصوّر یہ ہے کہ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور انہیں صرف اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی کی ہدایات کا پابند ہونا چاہیے۔ یہ کسی قوم یا کسی ملک کا دین نہیں ہے۔ اس کا خطاب ہر فرد بشر سے ہے۔ وہ سب کے لیے دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہیں کھولتا ہے۔ وہ صحیح معنی میں انسان کے لیے دینِ رحمت ہے۔

امر بالمعروف یہ ہے کہ دنیا کو حق و صداقت کی، امن و آشتی کی، دیانت و امانت کی، عفت و عصمت کی اور تمام ہی اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی جائے۔ امر بالمعروف یہ ہے کہ ایک دوسرے کے حقوق بیان کیے جائیں اور انہیں ادا کرنے کی ترغیب دی جائے۔ ایک ایک فرد کے ذہن میں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی جائے کہ دنیا کا ہر فرد کچھ حقوق رکھتا ہے، ان حقوق کی پاس داری لازم ہے۔ عزیزوں اور قرابت داروں ہی کے نہیں، پڑوسیوں کے، اجنبیوں اور مسافروں کے، عقیدہ اور مذہب میں اختلاف رکھنے والوں کے، ہم وطنوں اور دوسرے وطن والوں کے بھی حقوق ہیں۔ ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی لازماً حفاظت ہونی چاہیے۔ اس کے برخلاف جھوٹ، بددیانتی، وعدہ خلافی، زناکاری اور بے حیائی جیسے اخلاق سے گرے ہوئے تمام اعمال 'منکر' ہیں۔ اسی طرح ظلم، حق تلفی، احسان فراموشی، خوں ریزی، قتل و غارت گری اور انسانی حقوق کی پامالی بھی منکرات میں آتے ہیں۔ ان سے باز رکھنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

اسلام چاہتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اس عظیم فرض کو ادا کرنے کے لیے امت مسلمہ کھڑی ہو جائے اور اس کا ہر فرد اس کے لیے اپنی طاقت اور اثرات کو ممکنہ حد تک استعمال کرے۔ جو شخص وعظ و نصیحت کر سکتا ہے وہ وعظ و نصیحت اور ترغیب و تشویق کے ذریعہ نیکیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔ جس کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درس و تدریس اور تعلیم کے مواقع حاصل ہیں وہ اس راہ سے یہ فرض ادا کرے۔ ایک مسلمان جس دائرہ میں بھی 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا فرض انجام دے سکتا ہے۔ اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ اس دائرہ میں یہ فرض ضرور انجام پائے۔ اس کے لیے وقت ضرورت ذاتی اور سماجی اثر و رسوخ اور سیاسی طاقت کا استعمال بھی صحیح ہوگا۔ کسی کو یہ طاقت ہوگی کہ اپنے گھر اور خاندان کو معروفات کا پابند بنائے اور منکرات سے باز رکھ سکے، کوئی اس حیثیت میں ہوگا کہ اپنی بستی میں معروفات قائم کر سکے اور منکرات مٹا سکے، کسی کو اپنے شہر میں اس پر عمل کا موقع اور استطاعت حاصل ہوگی اور کوئی حکومت کی سطح پر اسے انجام دینے کے موقف میں ہوگا۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ امتِ مسلمہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے لیے کھڑی ہو جائے۔ اس کا ہر فرد نیکیوں کے لیے ماحول کو سازگار بنانے اور برائیوں کے خلاف ماحول کو تیار کرنے میں اپنی سی جدوجہد کرے۔ یہ وہ کام ہے جسے اس امت کو اسلامی ریاست میں میں بھی انجام دینا ہے اور غیر اسلامی ریاست میں بھی۔ اسی سے اس کا تشخص اور امتیازی حیثیت باقی رہے گی اور وہ اللہ کی رحمت کی مستحق ہوگی۔

عدل پر قائم رہنا اور عدل قائم کرنا

اسلام نے ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنے اور اس کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ (الاعراف: ۲۹)	تم کہہ دو میرے رب نے عدل و قسط کا حکم دیا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النحل: ۹۰)	بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو (ان کا حق) دینے کا اور کھلی بے حیائی، منکر اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

یہاں عدل و احسان کے حکم کے ساتھ بغی و عدوان سے منع بھی کیا گیا ہے۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں لازم وملزوم ہیں۔ جہاں عدل وانصاف ہوگا ظلم وزیادتی قدم نہ جما سکے گی اور جہاں ظلم کی حکمرانی ہوگی عدل رخصت ہوجائے گا۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ایک ایسی امت کی حیثیت سے ابھارا ہے جو اللہ کے دین کی علم بردار ہوگی اور دنیا میں عدل وانصاف کی شہادت دے گی۔ وہ انہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی فرد یا گروہ پر دستِ تعدی دراز کریں، چاہے اس سے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں اور اس نے کتنی ہی زیادتی کیوں نہ کی ہو۔ عدل وانصاف تقویٰ کی علامت ہے اور مسلمان کسی حال میں تقویٰ اور خدا ترسی کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ قرآن مجید میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	اے ایمان والو اللہ کے لیے کھڑے
قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ	ہونے والے بن جاؤ، عدل وانصاف کی
بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	گواہی دینے کے لیے کسی قوم کی دشمنی تمہیں
شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا	اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کی راہ
اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ	سے ہٹ جاؤ۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے
لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ	قریب تر روش ہے اور اللہ سے ڈرتے
اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝	رہو۔ اللہ، جو کچھ تم کرتے ہو اس سے
(المائدہ: ۸)	باخبر ہے۔

قرآن مجید نے یہ حقیقت بھی کھول کر رکھ دی ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کی نافرمانی اور ظلم وزیادتی کی راہ اختیار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایک وقتِ خاص تک مہلت دیتا ہے۔ پھر اس کی مہلت ختم ہوجاتی اور وہ اللہ کے عذاب کی مستحق قرار پاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ تاریخ کا حوالہ دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ	تمہارے رب کی پکڑ اسی طرح
إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ	ہوتی ہے، جب کہ وہ ظلم کی راہ پر
إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ۝	چلنے والی بستیوں کو پکڑتا ہے۔ بے شک
(ہود: ۱۰۲)	اس کی پکڑ دردناک اور سخت ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان اللہ لیملی للظالم حتیٰ اذا اخذہ لم یفلتہ[1]
بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو ضرور مہلت دیتا ہے لیکن جب اسے پکڑتا ہے تو اسے چھوڑتا نہیں ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مظلوم کی آہ سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے حضرت معاذؓ کو یمن کے گورنر کی حیثیت سے روانہ فرمایا تو بعض نصیحتیں فرمائیں۔ ان میں ایک نصیحت یہ تھی:

واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا وبین اللہ حجاب[2]
مظلوم کی دعا سے بچو اس لیے کہ اس دعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ایاک دعوۃ المظلوم فانما یسأل اللہ تعالیٰ حقہ وان اللہ لا یمنع ذا حق حقہ[3]
مظلوم کی دعا سے بچو، اس لیے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ سے اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی حق دار کو اس کے حق سے منع نہیں کرتا۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مظلوم چاہے غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اس کی بد دعا سے بچو[4] اس کا مطلب یہ ہے کہ مظلوم کوئی بھی ہو اور اس پر کسی بھی قسم کی زیادتی ہوئی ہو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور سنے گا اور یقیناً اس کی مدد کرے گا۔

مظلوم جب اس احساس کے ساتھ اللہ کو پکارتا ہے کہ ظالم کے مقابلہ کی اس میں طاقت نہیں ہے۔ صرف وہی اس کی مدد اور اس کے حقوق کی حفاظت کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کی فریاد بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے اور اس کے لیے درِ اجابت کھل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی حق دار کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا۔

۱ـه بخاری، کتاب التفسیر (سورۃ ہود) باب کذلک اخذ ربک الآیہ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم۔
۲ـه بخاری، کتاب المظالم، باب الاتقاء والحذر من دعوۃ المظلوم، مسلم، کتاب الایمان، باب الدعا الی الشہادتین۔
۳ـه مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الظلم بحوالہ بیہقی۔
۴ـه مناوی، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۴۰۵/۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور روایت میں ظلم کرنے ہی سے نہیں ظالم کا ساتھ دینے، اس کی تائید و حمایت کرنے اور اسے تقویت پہونچانے پر شدید وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت اوس بن شرحبیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

من مشی مع ظالم	جو شخص کسی ظلم کے ساتھ چلے تاکہ اسے
لیقویه وهو یعلم انه ظالم	تقویت پہونچائے اور وہ جانتا بھی ہو کہ وہ
فقد خرج من الاسلام[1]	ظالم ہے تو وہ اسلام (کے طریقہ) سے نکل گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جانتے بوجھتے ظلم کی تائید کرنا اور ظالم کی حمایت میں کھڑا ہوجانا کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے، یا یہ کہ یہ اہلِ ایمان کی روش نہیں ہے۔ ظلم کی تائید کرکے آدمی ان کے طریقہ سے ہٹ جائے گا۔

یہ حقیقت امت کے ہر فرد کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہنی چاہیے کہ وہ عدل و قسط کا داعی اور منّاد ہے۔ اس نے ظلم کی راہ اختیار کی تو اسلام کی صریح تعلیمات کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا اور اللہ کے غضب کو دعوت دے گا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اور جس سماج میں بھی ہو، اس کا دامن ظلم و زیادتی سے پاک ہونا چاہیے۔ وہ کسی پر دست درازی نہ کرے، کسی ظالم کا ساتھ نہ دے، بلکہ ظلم کے خلاف محاذ آرا رہے۔

دفاع کا حق

ہر انسان کا یہ فطری حق ہے کہ اپنی جان، مال، جائیداد اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور کسی طرف سے اس پر حملہ ہو تو اس کا دفاع کرے۔

انسان کا گھر اور خاندان اس کا اپنا ہے۔ اسے اپنے بیوی بچوں، ماں باپ اور افرادِ خاندان سے جذباتی تعلق ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات وہ اپنی ذات سے زیادہ ان سے محبت کرتا ہے۔ اس پر ان کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ اس کا یہ حق ہے کہ انھیں ظلم و زیادتی کا شکار ہونے نہ دے اور ان پر کسی قسم کی دراز دستی یا حملہ ہو تو ان کا دفاع کرے۔ بعض صورتوں میں اپنا اور اہلِ خاندان کا دفاع آدمی پر واجب ہوجاتا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الظلم بحوالہ بیہقی ورواہ الطبرانی والضیاء المقدسی وضعفہ المنذری التیسیر لشرح الجامع الصغیر ۲/۴۴۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح ایک مہذب سماج کے ہر فرد کا یہ حق ہے کہ وہ مظلوم کا دفاع کرے اور ظالم کا جواب دے۔ اگر کسی کے گھر ڈاکو گھس آئیں اور اس پر حملہ آور ہوں اور اس کا مال واسباب لوٹنے لگیں تو خود اسے بھی دفاع کا حق ہے اور پاس پڑوس کے لوگوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ اس کی مدد کریں اور اسے ظلم وزیادتی سے بچائیں۔ اس میں اگر حملہ آور مارا جائے تو دفاع کرنے والے کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ اس لیے کہ حملہ آور ایک مجرم ہے اور دفاع کرنے والے کا کوئی جرم نہیں ہے۔ وہ اسے جرم سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اگر دفاع کرنے والا اس کوشش میں مارا جائے تو وہ ہمدردی کا مستحق ہوگا اور اس کی اخلاقی اور قانونی مدد ضروری ہوگی۔

دفاع کے اس حق کو دنیا کا ہر مہذب قانون تسلیم کرتا ہے۔ اسلام نے بھی اسے ایک بنیادی حق کے طور پر مانا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کو اپنی جان، مال، عزت آبرو اور اپنے خاندان کے دفاع کا پورا حق حاصل ہے۔ ایک مسلمان کی جان اس راہ میں چلی جائے تو وہ شہادت کا مقام حاصل کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ یہاں ایک روایت پیش کی جا رہی ہے۔ حضرت سعید بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

من قُتل دون مالہ فھو	جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا
شہید ومن قُتل دون دینہ	جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں
فھو شہید ومن قُتل دون	مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے نفس کی حفاظت
دمہ فھو شہید ومن قُتل	میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے گھر والوں
دون اھلہ فھو شہید[1]	کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

دفاع کے سلسلہ میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ یہ ذمہ داری اصلاً ریاست کی ہے کہ وہ شہریوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرے۔ کسی شہری یا شہریوں کے کسی گروہ کو اپنے دفاع کی اس وقت ضرورت پیش آتی ہے جب کہ اچانک حملہ ہو اور ریاست کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے

---

[1] ترمذی، کتاب الدیات، باب ما جاء فی من قتل دون مالہ فھو شہید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا موقع نہ ملے یا وہ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جہاں انسان یہ دیکھے کہ اس کے جان ومال یا بنیادی حقوق کو خطرات لاحق ہیں، پہلے حکومت کو اس کی ذمہ داری یاد دلائے اور اس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر اس کا موقع نہ ہو یا حکومت کی طرف سے غفلت برتی جائے تو آدمی دفاع کا پورا حق رکھتا ہے۔

۲۔ دفاع میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے گا کہ طاقت کا کم سے کم استعمال ہو۔ اگر حملہ آور صرف ڈرانے دھمکانے یا شور مچانے سے فرار کی راہ اختیار کر لے تو اسے زخمی کرنے یا قتل کرنے کی کوشش نہیں ہوگی۔ اس کی جان اسی وقت لی جائے گی جب کہ اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر کارگر نہ معلوم ہو۔

دفاع کا حق ایک تسلیم شدہ حق ہے۔ اس سے سماج کے کم زور ترین فرد کو بھی یہ حوصلہ ملتا ہے کہ اس کی جان مال اور بیوی بچے ظالموں کے رحم وکرم پر نہیں ہیں۔ وقتِ ضرورت اگر اسے ریاست کی یا قریب کے کسی فرد کی مدد نہ بھی ملے تو وہ خود اپنے بل پر اپنی، اپنی جائیداد اور اپنے خاندان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ ایک مسلمان نازک اور مخدوش حالات میں اپنے اس حق کا استعمال کرتا ہے تو اسلام کی تعلیم پر بھی عمل کرتا ہے اور وقت کے قانون کی بھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

انتقام کا حق

اسلام ظلم وزیادتی کو کسی حال میں روا نہیں رکھتا۔ وہ اس کا ہر طرح سے سدِّ باب چاہتا ہے۔ اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی پر ظلم ہوا یا اس کا کوئی نقصان ہوا ہے تو وہ مجرم سے انتقام کا حق دیتا ہے۔ قرآن مجید نے بڑے نازک اور مشکل حالات میں انسان کے اس حق کا اعلان کیا۔

سورۂ شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی، جہاں مسلمان گوناگوں زیادتیوں کے شکار تھے اور سخت مشکلات اور آزمائشوں کے ماحول میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس سورہ میں ایک جگہ اہلِ ایمان کی ستائش کی گئی ہے کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس پر اعتماد اور توکل ہوتا ہے، ان کا دامن کبائر سے آلودہ نہیں ہوتا، کسی کے غلط رویہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ان کے اندر طیش اور غصہ ابھرتا ہے تو وہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔ وہ اللہ کی پکار پر لبیک کہتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات باہم مشورہ سے انجام دیتے ہیں اور خدا کی راہ میں انفاق کرتے ہیں۔ ان خوبیوں کے ذکر کے بعد فرمایا۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنتَصِرُونَ (الشوریٰ: ۳۹)

وہ کہ جن پر ظلم ہوتا ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔

اس سے بعض باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ یہ خیال غلط ہے اور آیت سے اس غلط خیال کی تردید ہوتی ہے کہ اللہ کے نیک بندے کم زور، ناتواں، بزدل اور کم ہمت ہوتے ہیں۔ ان کو جو چاہے ظلم کا نشانہ بنا سکتا ہے، بلکہ خدا ترس اور متقی انسان وہ ہیں جو ظلم کے سامنے سپر نہیں ڈال لیتے، وہ ظالم کا مقابلہ کرتے ہیں، وہ لقمۂ تر نہیں ہوتے کہ جو چاہے انھیں ہڑپ کر جائے۔ کوئی ان پر زیادتی کرتا ہے تو اس کا جواب دیتے ہیں۔ یہ ان کی نیکی اور تقویٰ کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ سماج کے نیک اور صالح افراد کے بارے میں اگر یہ تصور عام ہو جائے کہ وہ مجبور محض ہوتے ہیں اور کسی بھی زیادتی کا جواب دینا ان کے بس میں نہیں ہے تو مخالف ماحول میں ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا اور معاشرہ پر اس کا انتہائی خراب اثر پڑے گا کہ لوگ بے بسی اور ناتوانی کو نیکی اور تقویٰ کی لازمی خصوصیت سمجھنے لگیں گے۔

انتقام کا مطلب ہے زیادتی کا بدلہ لینا۔ اس کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ کسی پر ظلم ہو۔ کسی بے گناہ اور معصوم پر دست درازی کرنا انتقام نہیں صریح ظلم ہے۔ اہلِ ایمان کا دامن اس سے پاک ہوتا ہے البتہ ان پر ظلم ہو تو ان کو بدلہ لینے کا حق ہے اور اس حق کے استعمال کو کسی بھی طرح ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ بعض حالات میں یہ پسندیدہ قرار پاتا ہے۔

اسلام نے انتقام کا حق تسلیم کرنے کے ساتھ اس بات کا پابند بنایا ہے کہ ظلم زیادتی جتنی ہوئی ہے انتقام بھی اتنا ہی ہو۔ اس حد سے آگے بڑھنا خود ایک ظلم اور قابلِ مواخذہ جرم ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ کسی نے ایک طمانچہ مارا تو انتقام میں اس کا ہاتھ ہی قلم کر دیا جائے، یا بدزبانی کی تو اس کے دانت توڑ دیے جائیں۔ اس ظلم کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ہدایات بہت واضح ہیں۔ ارشاد ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ	پس جس نے تم پر زیادتی کی تو تم بھی
فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ	اسی جیسی زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی
مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ	کی ہے (اس سے زیادہ نہیں) اور اللہ سے
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ	ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ اللہ ان
الْمُتَّقِیْنَ ۝ (البقرہ : ۱۹۴)	لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔

قرآن مجید نے انتقام کی اس حد کو واضح کرنے کے لیے 'قصاص' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی رُو سے یہ بات غلط ہے کہ ایک شخص کے بدلے میں دس افراد کی جان لی جائے، عورت قتل ہوئی تو مرد کو قتل کیا جائے۔ غلام نے قتل کا ارتکاب کیا ہے تو اس کے بدلہ میں آزاد کو تہِ تیغ کر دیا جائے۔ (البقرہ : ۱۷۸) قانونِ قصاص کی بعض دفعات توریت کے حوالہ سے بیان بھی ہوئی ہیں۔ (المائدہ : ۴۵) احادیث میں اور علماءِ شریعت کے ہاں اس کی مزید تفصیلات ملتی ہیں۔

انتقام لینے کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں :

۱۔ زیادتی کا بروقت اس حد تک جواب دیا جا سکتا ہے جس حد تک زیادتی ہوئی ہے۔

۲۔ انتقام میں شرعی اور اخلاقی حدود کی پابندی ضروری ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص نے کسی کو، اس کے ہاتھ پیر، کان ناک کاٹ کر ہلاک کیا، یا میت کا مثلہ کیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تو انتقام کے نام پر قاتل کے ساتھ یہ رویہ نہیں اختیار کیا جائے گا، بلکہ قاتل کو قانون کے مطابق صرف قتل کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح کسی نے کسی عورت کے ساتھ زنا کیا تو اس کا انتقام یہ نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا بیٹی کے ساتھ یہ حرکت کی جائے، بلکہ اسے از روئے قانون زنا کی سزا دی جائے گی۔

۳۔ زبانی زیادتیوں کا بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی اخلاقی حدود کی پابندی کرنی ہوگی۔ ان حدود سے آگے بڑھنا ناجائز ہے۔ جیسے کسی نے دشنام طرازی کی تو اس کے جواب میں دشنام طرازی کی جائے، یا تہمت اور افترا پردازی ہونے لگے یا پورے خاندان ہی پر تبرا شروع کر دیا جائے۔

۴۔ ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کرنا اور آواز اٹھانا جائز ہے تاکہ ظالم کا ظالم ہونا بے نقاب ہو اور مظلوم کو سماج سے مدد ملے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ انتقام کے لیے ریاستی قانون کی مدد لی جائے۔ انتقام کی بہت سی صورتیں وہ ہو سکتی ہیں کہ قانون کی مدد ہی سے ان پر عمل ہو سکتا ہے، اسے نظر انداز کر کے قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا جائے گا۔

اس طرح کی اور بھی شرائط ہیں، انھیں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

عفو پسندیدہ ہے

مظلوم کو ظالم سے انتقام لینے کا حق ضرور ہے لیکن اس کے لیے فرض اور واجب نہیں ہے۔ وہ اپنے اس حق کو استعمال نہ کرے اور صبر و تحمل اور عفو و درگزر کی روش اختیار کرے تو یہی نتائج کے لحاظ سے بہتر ہوگا۔ یہ اس کی اخلاقی فتح ہوگی اور یہی مطلوب ہے۔ ارشاد ہے:۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ط وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ (النحل: ۱۲۶)

اگر بدلہ لو تو اسی قدر بدلہ لو جس قدر کہ تم کو تکلیف پہونچائی گئی ہے لیکن اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں یقیناً بہتر ہے۔

اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ انتقام ضروری نہیں ہے، لیکن آدمی انتقام لینا ہی چاہے تو جتنی زیادتی ہوئی ہے یا جتنا نقصان پہونچا ہے اسی کے بقدر انتقام لے سکتا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ آدمی صبر سے کام لے۔ سورۂ شوریٰ میں یہ پوری بات زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ج فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ

اور برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔ لیکن جو شخص معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی الزام نہیں ہے۔ الزام تو صرف ان لوگوں پر آتا ہے جو لوگوں پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ: ۴۰-۴۳)

ظلم اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جو شخص (زیادتی پر) صبر کرے اور معاف کردے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

اس طرح اسلام نے انسان کو ظلم کے انتقام کا قانونی حق بھی دیا اور اس کے ساتھ عفوودرگزر اور اعلیٰ اخلاقی رویّہ اختیار کرنے کی ترغیب بھی دی۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کو انتقامی کارروائی ناگزیر حالات ہی میں کرنی چاہیئے جب کہ اس سے کوئی بڑا شخصی یا ملّی مفاد وابستہ ہو۔ ورنہ بہتر یہی ہے کہ وہ عفوودرگزر سے کام لے اور معاف کردے۔

قرآن مجید نے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی عفوودرگزر کا رویّہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ یہود مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے، طرح طرح کی سازشوں میں لگے رہتے، ان کے متعلق کہا گیا۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (المائدہ: ۱۳)

تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کی اطلاع ہوتی ہی رہتی ہے، البتہ ان میں سے چند ایک اس سے مستثنیٰ ہیں، تو آپ انھیں معاف کردیں اور درگزر کریں۔ بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہاں 'عفو' اور 'صفح' دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دونوں کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں[1]۔ اس میں غلط کار کو سزا نہ دینا، غصّے اور غضب کا اظہار نہ کرنا اور لعن طعن سے احتراز کرنا جیسی خوبیاں آتی ہیں۔ یہ گو ایک بڑا اخلاقی رویہ ہے، لیکن اس سے اونچا کردار یہ ہے کہ آدمی زیادتی کرنے والے کو دل سے معاف کردے اور اس کے ساتھ اس

---

[1] القاموس میں ہے صفح کمنع، اعرض وترک۔ اور 'صفح عنہ' کے معنی عفا دئے ہیں۔ اور العفو کے ایک معنی 'الصفح وترک عقوبۃ المستحق' بیان ہوئے ہیں۔ مادہ عفو۔ س ۱۱۸۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح معاملہ کرے جیسے اس نے زیادتی نہ کی ہو۔ اسلام یہی کردار چاہتا ہے۔ مشرکین کے ساتھ بھی، ان کی تمام زیادتیوں کے باوجود اسی صفح و درگزر کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَقِيلِهِ يٰرَبِّ إِنَّ	رسول کا یہ قول کہ اے رب!
هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُونَ ۝	بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان
فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ	نہیں لا رہے ہیں۔ آپ ان سے درگزر
سَلٰمٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝	کیجئے اور کہئے کہ تم کو سلام ہے۔ یہ
(الزخرف: ۸۸-۸۹)	عن قریب جان لیں گے۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ	بے شک قیامت ضرور آنے والی
فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ۝	ہے۔ پس آپ انہیں اچھی طرح
(الحجر: ۸۵)	درگزر فرمائیں۔

قرآن مجید نے عفو و درگزر کے ساتھ اصلاح کا بھی حکم دیا ہے۔ سورۂ شوریٰ کی آیات کا حوالہ اس سے پہلے آچکا ہے۔ ان میں سے ایک آیت کا فقرہ یہ ہے۔

فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ	پس جس نے معاف کیا اور اصلاح
عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ	کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔
الظّٰلِمِينَ ۝ (الشوریٰ: ۴۰)	بے شک وہ ظالموں کو ناپسند کرتا ہے

اصلاحِ حال کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ تعلقات میں بگاڑ کیوں آیا اور اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے اسے ختم کرنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ نفرت اور عداوت کی جگہ محبت کا ماحول کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ اس کے لیے سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی۔ اصلاحِ حال کے لیے دشمن کو پہلے معاف کرنا ہوگا اور پھر اس کے بعد اس سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنی ہوگی۔

انتقام اور عفو میں سے ہر ایک کا موقع جدا ہے

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف تو اہلِ ایمان کی خوبیوں کے ذیل میں کہا گیا ہے کہ ان پر زیادتی ہوتی ہے تو وہ انتقام لیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے صبر اور عفو و درگزر کی تعریف کی گئی ہے۔ کیا ان میں کوئی تضاد نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں کا الگ الگ موقع و محل ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے کہ معاشرہ میں مسلمان اتنا کم زور اور بے بس ہو کر رہے کہ جو چاہے آسانی سے اس پر دست درازی کر سکے، بلکہ اسے اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ چاہے تو انتقام لے سکے یا معاف کر دے۔ جہاں یہ محسوس ہو کہ عفو و درگزر سے ظالم کا حوصلہ بڑھے گا، بے گناہ اس کی زیادتیوں کا نشانہ بنیں گے وہاں انتقام بہتر ہے تا کہ اس کی ہمت شکنی ہو اور وہ مزید کسی کے ساتھ زیادتی کی جرأت نہ کر سکے، لیکن اگر آدمی یہ دیکھے کہ ظالم کو اپنے ظلم پر ندامت ہے، وہ اپنی غلطی کو محسوس کر رہا ہے، معاف کرنے سے اس پر بہتر اثرات پڑیں گے تو معاف کرنا افضل ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ظلم کا خاتمہ پیشِ نظر رہے۔ اسی لحاظ سے عفو و درگزر یا انتقام کا معاملہ کیا جائے۔

علامہ ابن عربی مالکی کہتے ہیں کہ سورۂ شوریٰ میں انتصار یا بدلہ لینے کا ذکر ایک قابلِ تحسین عمل کی حیثیت سے آیا ہے۔ دوسرے مقامات پر عفو و درگزر کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے ایک نے دوسرے کو منسوخ کر دیا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ ان کو دو مختلف صورتوں پر محمول کیا جائے، (یہی صحیح ہے) ایک صورت یہ کہ باغی یا ظالم علانیہ غلط کاری کر رہا ہو، عام لوگوں سے بدزبانی کرتا ہو، بے حیائی کا مرتکب ہو، چھوٹے بڑے کو ایذا پہنچاتا ہو۔ ایسے شخص سے انتقام لینا افضل ہے۔ اس صورتِ حال کے بارے میں امام نخعیؒ نے کہا ہے کہ وہ (سلف) اسے ناپسند کرتے تھے کہ آدمی خود کو اس قدر ذلیل اور کم زور بنائے رکھے کہ فساق و فجار جری ہو جائیں۔

دوسری صورت یہ کہ غلطی کسی سے اتفاقی طور سے ہو جائے اور وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور معافی کا طالب ہو تو اسے معاف کر دینا افضل ہے۔

علامہ قرطبی نے اس توجیہ کی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کیا طبری نے بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی توجیہ کی ہے[1]

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ عفو و درگزر کے نتیجہ میں فتنہ دب رہا ہے اور غلط کار اپنی روش سے باز آرہا ہے تو عفو پسندیدہ ہے۔ لیکن اگر عفو و درگزر سے مجرم کا حوصلہ بڑھ جائے اور اس کے غیظ و غضب کو تقویت پہونچے تو انتقام لینا صحیح ہے۔[2]

یہ باتیں بظاہر اسلامی معاشرہ کے پیش نظر کہی گئی ہیں۔ غیر اسلامی معاشرہ میں ایک مسلمان کا عام رویہ عفو و درگزر ہی کا ہونا چاہیے لیکن اسے ایسی صورت حال سے بھی سابقہ پیش آسکتا ہے جب کہ وہ قانون کی حدود میں حقِ انتقام استعمال کرنے اور دادرسی کی کوشش پر مجبور ہو جائے۔

غصّہ اور اشتعال سے پرہیز

انسان کو ٹھنڈے اور پرسکون مزاج کا ہونا چاہیے۔ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم اٹھانا سخت نادانی ہے۔ اس کی کسی بھی صاحبِ ہوش اور خردمند شخص سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ بعض اوقات قصداً غصّہ دلانے اور مشتعل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ انسان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اس کوشش کو ناکام کر دے۔ اشتعال انگیزی اسی لیے ہوتی ہے کہ آدمی بھڑک اٹھے اور بے قابو ہو جائے اور وہ اقدام کر بیٹھے جو ٹھنڈے دل و دماغ والا انسان کبھی پسند نہیں کرے گا۔ اس سے اشتعال دلانے والا فائدہ اٹھاتا ہے اور مشتعل ہونے والا نقصان میں رہتا ہے۔

اہلِ ایمان کی یہ خوبی بیان ہوئی ہے کہ وہ اشتعال میں نہیں آتے، غیظ و غضب کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کسی کی نازیبا حرکت اور غلط روش پر انھیں غصہ آتا بھی ہے تو عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔

وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ ‏ جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ج ۸ جزء ۱۶ ص ۲۶-۲۷۔ دارالکتب العلمیہ لبنان ۱۹۸۸ء

[2] رازی، التفسیر الکبیر: ج ۱۴ جزء ۲۷ ص ۱۵۲۔ دارالکتب العلمیہ لبنان ۱۹۹۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یَغْفِرُوْنَ ٥ (الشوریٰ : ۳۷) کر دیتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی جن خوبیوں کی وجہ سے ستائش کی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے:

وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ — وہ غصہ کو پی جانے والے اور

الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط (آل عمران: ۱۳۴) — لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صاحب نے نصیحت کی درخواست کی (غالباً ان میں یہ کمزوری تھی کہ وہ جلد غصہ میں آجایا کرتے تھے) ان کے مناسب حال آپ نے فرمایا' لَا تَغْضَبْ ' (غصہ مت کیا کرو) انہوں نے بار بار یہی درخواست کی اس توقع پر کہ شاید آپ مزید اور کچھ نصیحت فرمائیں گے، لیکن آپؐ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ غصہ مت کیا کرو۔[1]

آدمی کی عظمت جسمانی لحاظ سے توانا اور طاقت ور ہونے سے زیادہ اخلاقی لحاظ سے مضبوط ہونے میں ہے۔ وہ اشتعال انگیز حالات میں اپنے جذبات کو جتنا قابو میں رکھے گا اتنا ہی اپنی عظمت کا ثبوت دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لیس الشدید بالصرعة — طاقت ور وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ
انما الشدید الذی یملك — دے بلکہ طاقت ور وہ ہے جو غصہ کے
نفسه عند الغضب[2] — وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

غصہ کا پینا تلخ گھونٹ کا پینا ہے۔ یہ آسانی سے حلق کے نیچے نہیں اترتا لیکن اللہ کو یہ گھونٹ سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما تجرع عبد افضل — بندے نے کوئی ایسا گھونٹ
عند الله عز وجل من — نہیں پیا جس کی اللہ عز وجل کے نزدیک
جرعة غیظ یکظمها ابتغاء — غصہ کے اس گھونٹ سے زیادہ

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب الخ

[2] بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب الخ۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب الخ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وجہ اللہ تعالیٰ[1] فضیلت ہو جو وہ اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے پیتا ہے۔

مطلب یہ کہ غصہ کا جو گھونٹ آدمی اللہ کی رضا کے لیے پیتا ہے وہ اس کے نزدیک سب سے قیمتی گھونٹ ہے۔ اس سے زیادہ کوئی گھونٹ اسے پسند نہیں ہے۔ غصہ کی حالت میں آدمی انجام سے بے پرواہ ہو کر کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ خاموش رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ صحیح رویہ نہیں ہے۔ اگر معاملہ حق و باطل کا ہو تو غصے کا آنا یقینی ہے محض اپنے غلط جذبہ اور نفس کی تسکین کے لیے غصے کا مظاہرہ غلط ہے۔ اس سے حالات کو ٹھیک کرنے میں مدد نہیں ملتی بلکہ وہ مزید خراب ہو سکتے ہیں، اس سے بچنا چاہیے۔

شیریں کلامی

بعض اوقات زبان کے غلط استعمال سے حالات غلط رخ اختیار کر لیتے ہیں اور انھیں معمول پر لانا دشوار ہو جاتا ہے۔ شیریں کلامی حالات کو بگاڑ سے بچانے اور انھیں بہتر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اس کا مخاطب پر اچھا اثر پڑتا ہے اور وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ بات سننے اور غور کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اخلاق کا یہ اولین زینہ ہے۔ اسی کے بعد اس کی اعلیٰ منزلیں طے ہوتی ہیں بنو اسرائیل کو ہدایت کی گئی تھی۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: ۸۳) لوگوں سے بات اچھے طریقہ سے کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو......

یہاں ایک بات قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ نماز اور زکوٰۃ سے پہلے حسن کلام کا ذکر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مخاطب سے اولین تعلق کلام ہی سے قائم ہوتا ہے۔ اس کے لیے بسا اوقات اس کی اہمیت نماز اور زکوٰۃ سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بولنے والے کی نماز اور زکوٰۃ اور دین داری کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الغضب والکبر۔ بحوالہ احمد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے طرزِ گفتگو اور اندازِ تخاطب کو دیکھتا ہے، اس لیے حکم ہوا کہ لوگوں سے شائستہ لب ولہجہ میں بات کرو۔

قرآن مجید نے "قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بات انتہائی حسین اور سراسر جمال ہو۔ اس کا ایک ایک لفظ حسن وجمال میں ڈوبا ہوا ہو[1]

حسنِ کلام میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی حق بات کہے، عدل وانصاف کی بات کہے، اخلاق کی تعلیم دے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کا تعارف کرائے، اس کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کرے، اسے قبول کرنے کی دعوت دے معاشرہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دے۔ اس سے سماج میں آدمی کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ وہ ایک متعین نظریہ کا حامل اور اصول پسند سمجھا جاتا ہے۔ اس کی باتوں کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاتا۔

یہی تعلیم اسلام کے ماننے والوں کو ان الفاظ میں دی گئی۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ	میرے بندوں (مسلمانوں) سے
هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطَانَ	کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔
یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطَانَ	بے شک شیطان انسانوں کے درمیان
کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا	فساد پیدا کر دیتا ہے۔ شیطان، انسان
(بنی اسرائیل: ۵۳)	کا کھلا دشمن ہے۔

مطلب یہ کہ بات کا وہ انداز اختیار کیا جائے جو بہتر ہو، جو سبّ وشتم، بدزبانی، طنز وتعریض، سختی اور درشتی، ذاتیات پر حملے اور الزام واتہام جیسی خرابیوں سے پاک ہو، جس میں محبت ہو، مٹھاس اور شیرینی ہو، دل موہ لینے والا اسلوب ہو اور جس سے مخاطب نفرت اور دوری کی جگہ ایک طرح کی کشش محسوس کرے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ غلط اندازِ تخاطب سے شیطان کو در آنے کا موقع مل جائے گا، وہ مخاطب کے جذبات کو بھڑکائے گا، بات کو سمجھنے اور سمجھ میں آجائے تو قبول کرنے نہ دے گا۔ غرض

---

[1] زمخشری، الکشاف: ۱/۱۶۰۔ دارالکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۵ء مع حاشیہ ابن المنیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کہ پورا ماحول خراب کر کے رکھ دے گا۔ شیطان کو اس کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ یہی کامیاب گفتگو ہے۔

یہ بات زیادہ تفصیل کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (حٰم السجدہ: ۳۴-۳۶)

نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی ہے۔ دفاع کرو تم اس طریقہ سے جو بہتر ہو، تو تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس شخص میں عداوت ہے وہ گویا گہرا دوست ہوگیا ہے۔ یہ خوبی ان ہی لوگوں کو ملتی ہے جن میں صبر و برداشت کا مادہ ہوتا ہے۔ اور یہ ان ہی کو ملتی ہے جو بڑے نصیبے والے ہیں۔ اگر (ایسے موقع پر) شیطان تمہیں ورغلانے لگے تو اللہ کی پناہ طلب کرو بے شک وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ان آیات میں سے ہر آیت اور اس کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے اور موجودہ حالات میں بہترین ہدایت اور راہنمائی فراہم کر رہا ہے۔ فرمایا وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ، مطلب یہ کہ نیکی اور بدی، کسی بھی ضابطۂ اخلاق اور قانون کے تحت، کسی بھی ہوش مند کی نظر میں اور کسی بھی حال میں برابر نہیں ہوسکتے۔ نیکی کو عزت و احترام سے دیکھا جائے گا۔ بدی اس سے محروم ہوگی اور ذلت و رسوائی اس کے حصے میں آئے گی۔ نیکی کے اثرات کچھ اور ہوں گے اور بدی کے نتائج کچھ اور۔ نیکی اپنے ساتھ خیر لائے گی اور بدی کے دامن میں شر و فساد ہوگا۔ نیکی کا انجام دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بدی کے انجام سے سراسر مختلف ہوگا، اس لیے نیکی کی راہ اختیار کرو اور بدی سے کنارہ کش رہو۔ مخالف اگر طنز و تعریض کر رہا ہے، بدگوئی، زبان درازی اور غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، جھوٹے الزامات لگا رہا اور بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو بھی تمہارے لیے زیب نہیں دیتا کہ تم بھی وہی راستہ اختیار کرو جو اس نے کیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد تم میں اور اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی فرق نہیں رہے گا۔ تمہارا رویہ اخلاقی لحاظ سے تمہارے حریف سے بلند تر ہونا چاہیے، وہ ہے 'اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ' اس کا مطلب یہ ہے کہ غلط باتوں کی تردید اور اس کے جواب کا تمہیں حق ہے لیکن اپنا دفاع بھی کرو تو اس طریقہ سے کرو جو بہتر اور شائستہ تر ہو، جس کے بارے میں دشمن کا دل بھی اندر سے کہے کہ شریفانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ بہت جلد تمہارے سامنے آئے گا اور تم دیکھو گے فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ جس شخص سے تمہاری عداوت چلی آ رہی ہے اس کی عداوت ختم ہو گئی ہے۔ وہ تمہارا دوست ہی نہیں بلکہ گہرا دوست ہو گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مخالف کو بہتر طریقہ سے جواب دینے کی جو ہدایت کی گئی ہے اس پر عمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ غصہ اور اشتعال کا مظاہرہ کرے تو صبر کیا جائے اور اگر وہ زیادتی کرے تو معاف کر دیا جائے۔ اگر وہ یہ طریقہ اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے گا اور ان کا دشمن ان کے سامنے اس طرح جھک جائے گا گویا وہ بہت قریبی دوست ہے[1]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول موجودہ حالات میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشتعال انگیزی کی کوشش کے باوجود اشتعال میں نہ آنا اور دشمنوں کے ساتھ عفو و درگزر سے کام لینا کامیابی کی کلید ہے اور چھوٹی چھوٹی بات پر برافروختہ ہونا اور صبر کا دامن چھوڑ بیٹھنا شکست و ناکامی کی علامت ہے۔

آگے ارشاد ہوا: وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ٥ یعنی یہ اعلیٰ کردار اور یہ پاکیزہ روش وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے صبر و ثبات کی دولت سے نوازا ہے، جو پہاڑ کی طرح اپنے موقف پر قائم رہیں اور جن کی نگاہیں اپنے مقصد اور نصب العین سے کبھی نہ ہٹیں۔ جن کی نگاہیں منزل پر ہوتی ہیں وہ راہ کے خس و خاشاک کا خیال نہیں کرتے، راستے کے کنکر پتھر اور روڑے ان کے عزم کو کمزور نہیں کرتے اور دشواریوں میں مسلسل اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ لیکن یہ عزم و ہمت اور حوصلہ خوش قسمت انسانوں اور بڑے نصیبے والوں ہی کو ملتا ہے۔

---

[1] رواہ البخاری تعلیقاً (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب باب الغضب والکبر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سلسلہ کی آخری ہدایت یہ ہے کہ ﴿وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ﴾ اس میں آگاہ کیا گیا ہے کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ساری کوشش کے باوجود شیطان تمہیں اکسانے لگے کہ اس قدر مخالفت ہو رہی ہے اور تم مہر بہ لب بیٹھے ہو، اتنی اشتعال انگیزی کے باوجود تم پر سکوت طاری ہے۔ تم بھی ترکی بہ ترکی جواب آخر کیوں نہیں دیتے۔ آخر یہ بزدلی اور دوں ہمتی کیوں ہے؟ ایسی صورت میں تم غلط ردعمل کا شکار ہو سکتے ہو۔ اس وقت تمہیں سمجھنا چاہیے کہ شیطان تمہیں اخلاقی پستی کی طرف لے جا رہا ہے۔ فوراً تمہیں اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ تمہیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ جو اللہ کو پکارے وہ اس کی ضرور سنتا ہے اور وہ ہر ایک کے دل سے باخبر ہے۔

کبر و غرور سے اجتناب

کبر ایک ایسی اخلاقی خرابی ہے جو تعلقات کو برابر کی سطح پر رہنے نہیں دیتی اور بلندی اور پستی کے جھوٹے جذبات ابھارتی ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا تصور کرے گا تو اس کا رویہ اس کے ساتھ لازماً حقارت آمیز ہوگا، وہ اسے مساوی سلوک کا حق دار نہیں سمجھے گا اور اس کے حقوق پامال کرنے میں بھی اسے تامل نہ ہوگا۔ کبر کا مرض کسی فرد میں ہو تو وہ ایک یا چند افراد کے ساتھ حقارت اور عدم مساوات کا معاملہ کر سکتا ہے لیکن اگر کسی قوم میں یہ بیماری ہو تو دوسری قوموں کو وہ کم تر اور فروتر سمجھے گی۔ انہیں عزت و احترام کا مقام نہیں دے گی اور وہ اس کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنتی رہیں گی۔

کبر و غرور کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ مال و دولت کی فراوانی، علمی تفوق اور برتری، سیاسی و سماجی حیثیت، تہذیب اور کلچر، تاریخ اور روایات اور حکومت و اقتدار جیسے اسباب پندار اور نخوت پیدا کرتے ہیں۔ اسلام نے بڑی سختی سے نخوت سے منع کیا ہے اور اسے شیطانی جذبہ قرار دیا ہے۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی تھیں ان میں ایک نصیحت یہ تھی:

وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّكَ لِلنَّاسِ — لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ (لقمان:۱۸)

زمین میں اترا کر مت چل۔ بے شک اللہ کسی شیخی کرنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

اس میں اس بات کی ہدایت ہے کہ اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھو، لوگوں سے بے رخی نہ برتو، یہ کبر کی علامت ہے۔ تہذیب، شرافت اور خوش خلقی کے ساتھ ان سے بات کرو۔ کسی کو حقیر اور کم تر سمجھ کر اسے خطاب نہ کرو۔ قرآن مجید نے 'ولا تصعّر' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مصدر تصعیر ہے۔ اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ 'تصعیر' اونٹ کی ایک بیماری کو کہا جاتا ہے، جس میں اس کی گردن ایک طرف جھک جاتی ہے۔ اور وہ دوسری طرف دیکھ نہیں پاتا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تکبر کی وجہ سے تمہاری وہ کیفیت نہ ہو جائے جو اونٹ کے اندر بیماری کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ پلٹ کر دیکھنا اور سیدھے منھ بات کرنا مشکل ہو جائے۔

تکبر اور نخوت کا اظہار انسان کی رفتار اور چال ڈھال سے بھی ہوتا ہے اس لیے فرمایا: 'وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا' یعنی تمہاری چال سے غرور نہ ٹپکے، متکبروں کی چال نہ معلوم ہو کہ زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو رہا ہو، بلکہ شریف اور مہذب انسانوں کی طرح چلو، تمہارے چلنے پھرنے سے تواضع اور خاکساری کا اظہار ہو، یہ محسوس ہو کہ یہ ایک شریف اور با اخلاق انسان ہے، اس سے ہر شخص آسانی سے مل سکتا ہے، اس کے سامنے اپنی بات رکھ سکتا ہے، وہ ہماری بات سنے گا اور ہمارے دکھ درد میں شریک ہوگا۔ بے تکلف اس کی صحبت اختیار کی جا سکتی ہے۔ وہ ناگواری نہیں بلکہ خوشی محسوس کرے گا۔

ایک اور موقع پر غرور کی چال سے ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۷، ۳۸)

زمین میں اکڑ کر نہ چلو تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو ان امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

انسان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ ایک مشتِ خاک، ایک بلبلا پانی کا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پانچ چھ فٹ کا انسان فخر کرے تو کس بات پر کرے؟ کیا وہ ٹھوکر مار کر سینۂ زمین شق کر دے گا یا اکڑ کر اور سر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندی کو پہونچ جائے گا، تو پھر کیوں وہ نخوت کا مظاہرہ کرتا ہے، کیوں نہیں فروتنی اور عاجزی اختیار کرتا۔ یہی حقیقت اس آیت میں سمجھائی گئی ہے۔

بہت سے لوگ زبان سے بھی شیخی بگھارتے ہیں اور ان کا رویہ بھی متکبرانہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بہت سے وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی عاجزی، خاکساری اور ناتوانی کا اعلان کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن ان کا پورا وجود گواہی دیتا ہے کہ وہ پندار میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں رویے غلط ہیں۔ اس سے انسان خدا کی رحمت سے دور اور خلقِ خدا کی محبت سے محروم ہو جاتا ہے۔

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی ایک اہم پیش کش

مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب

اسلام اور مشکلاتِ حیات

- اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں پر مشکلات اور مصائب کیوں آتے ہیں؟
- اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو ملی اور اجتماعی، شخصی اور انفرادی مشکلات سے کیوں گزارا جاتا ہے؟
- امراض، جسمانی تکالیف، مالی مشکلات، حادثات اور صدمات میں ایک مومن کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟
- مرض اور مشکلات حیات میں خودکشی کیوں ناجائز ہے؟
- مرض کی شدت میں کسی کی جان کیوں نہیں لی جاسکتی؟

یہ کتاب قرآن وحدیث کی روشنی میں ان سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے، مؤثر انداز بیان، دل نشین بحث اور علمی اسلوب اس کی حسین طباعت، خوب صورت سرورق۔ ضخامت ۸۸ صفحات۔ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتہ: مینجر مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

© rasailojaraid.com